جسّی۔فاصلوں کے آتنک کا ناول

پروفیسر علی احمد فاطمی

صدر،شعبۂ اردو،الٰہ آباد یونیورسٹی،الٰہ آباد(یوپی)،موبائل: 9415306239

''جسّی'' پرانے افسانہ نگار بشیر مالیر کوٹلوی کا پہلا ناول ہے۔ جو اسی سال منظرِ عام پر آیا ہے۔ تعارف، تاثر اور مکالماتی اسلوب سے ناول کا آغاز ہوتا ہے، لیکن اس تاثر میں تہذیب وثقافت کے جو اشارے ملتے ہیں اس سے پنجاب کی پنجابیت تو اُبھرتی ہی ہے ناول میں تخلیقیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ لطف اور کیفیت بھی، لوہڑی کی روایت بھی۔ دُلا بھٹی کی خصلت بھی، معصوم بچوں کی معصومیت بھی اور پنجابی زبان میں ڈوبی کہاوت بھی جس میں صرف پنجاب کا ہی نہیں زندگی کا رس ہے۔ تجربہ بھی اور کہیں کہیں فلسفہ بھی اور پھر یہ حزنیہ بھی:

> ''آج کل لوہڑی کی یہ دلچسپ اور مزیدار رسمیں پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ ترقی یافتہ شہروں میں تہوار بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔''

یہ حُزن اس لیے کہ تہوار، رسم ورواج صرف جشن نہیں ہوتے بلکہ تہذیب وثقافت اور باہمی میل ومحبت کا مؤثر اظہار ہوتے ہیں اور ناول بھی صرف قصّہ یا واقعہ نہیں ہوتے بلکہ زندگی کا تجربہ ہوتے ہیں بلکہ خود زندگی ہوتے ہیں۔ زندگی کی تہذیب اور سماجی ومعاشی رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی اور فکر وشعور کا سفر بھی۔ وارث علوی نے کہا تھا: ''شاعری تو آدھی زمین سے اوپر ہوتی ہے اور آدھی نیچے، لیکن ناول خالص زمین کی چیز ہوتا ہے۔'' اور وہ بھی پنجاب کی زمین جہاں اگری کلچر (Agriculture) کا غلبہ ہے اور جہاں گری کلچر ہے وہاں تو کلچر ہی کلچر ہے۔ جہاں آب ہے، وہاں آب وتاب ہے، زندگی کی آب وتاب، لیکن اب یہ آب مدھم پڑ رہی ہے۔ یہ چمک بازار واد میں اور آتنک واد میں ڈوب رہی ہے۔ بدلتا ہوا پنجاب، بدلتا ہوا ماحول، دودھ دہی کی جگہ چائے کافی تھرمس ہاٹ پاٹ۔ پگڑی پٹکا کی جگہ جینز شرٹ، کھیت باغ میں چوپال کی جگہ فارم ہاؤس، صوفہ سیٹ، ڈرائنگ روم اور پھر ایک حزن یہ بھی:

> ''گریجویشن اسی جیپ میں کرلے۔ بار بار مت سنایا کر۔ایم ایل اے کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے۔ تمھارے دوست کا باپ ایکسپورٹ کا نام کرتا ہے میرے پاس تو لے دے کے تین سو ایکڑ زمین ہے۔ دوسوا ایکڑ تو تیرے دادا دان ہی کر گئے۔ کچھ گردوارے کو دے دی۔ کچھ بیچ کر لوگوں کو کھلا گئے تالیاں بجوانے کے شوق میں...! ہماری خاندانی پانچ سوا ایکڑ تھی۔ دس ہزار کی گڈّی لے کر۔''

غرض کہ بدلتے ہوئے ماحول میں پنجاب کی وضع قطع، محبت اور محنت، تہذیب وثقافت کو کیسے بچایا جائے۔ جو ابتداً ایک خاندان اور ایک داستان کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، لیکن کربناک داستان تو کچھ اور ہی ہے بلونت سنگھ کا کھلکھلاتا ہوا، پنجاب کے کلچر میں ڈوبا ہوا کردار تو ہے، لیکن اب وہ بقول مصنف۔ ''وقت نے اس سے ہنسی مذاق سب کچھ چھین لیے اس کی جگہ سنجیدگی، اُداسی اور چڑچڑاپن دے دیا۔'' ''یہ وقت بھی ایسی سفّاک اور بے رحم شے ہے جو پنجاب ہنستے کھیلتے مسرت آمیز اور صحتمند معاشرہ کو بھی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ انسان کو تو بدلتا ہی ہے اشیاء کو بدل دیتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ پہلے اشیاء بدلتی ہیں پھر ان کی ضرورت، افادیت انسانوں کو بھی بدلنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مادیت کس طرح پہلے ثقافت اس کے بعد روحانیت کو بدل دیتی ہے ان جملوں میں چھپے اشاروں میں سمجھی جا سکتی ہے:

> ''شہروں میں جاگو کی روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ شادی کی درمیانی رات میں ننہال والے پیتل کی ایک گاگر لے کر اسے چراغوں سے سجاتے ہیں۔ آج کل تو ریڈی میڈ جاگو بھی مل جاتی ہے۔''

بظاہر ریڈی میڈ ایک لفظ ہے، لیکن اب وہ اشیاء تک محدود نہیں رہا۔ رسم ورواج، تیج وتہوار یہاں تک کہ محبت وانسانیت میں بھی داخل ہو چکا ہے۔ اس لیے تجارت اور بازار کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ پنجاب میں بطور خاص— مصنف نے جابجا ناول میں اس تبدیلی کے سلسلے میں معنی خیز اشارے کیے ہیں، لیکن پرانے پنجاب اور پرانی رسموں کو بھی خوب خوب

ظاہر کیا ہے۔ وہ ضروری بھی ہے کہ پنجاب اور خاص طور پر اس کے دیہات میں اب بھی بڑی حد تک پنجاب ہے اور شاید یہی ناول کا میڈیم ہے ورنہ اصل مسئلہ تو کچھ اور ہی ہے۔ فاسٹر نے کہا تھا۔ ''انسانی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو ظاہر کرنے کی جو قوت ناول میں پائی جاتی ہے وہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور یہی اسے دیگر فنون سے ممیّز بھی کرتی ہے۔''

ایک عرصہ کے بعد اردو کو ایک ایسا ناول ملا ہے جس میں دیہات ہے وہ بھی پنجاب کے دیہات، عورتوں کے گیت اور سنگیت ہیں۔ تیج تہوار ہیں جس کو ناول نگار نے بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ تعارف تاثر میں بھی پنجاب دیکھیے:

''ماضی بعید میں کچے مکان ہوا کرتے تھے۔ جاگو والے کچّے مکانوں کے برساتی پن نالے توڑ دیتے ہیں۔ گلی کے بلب اور ٹیوب لائٹیں توڑ دیتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں اگر کوئی بوڑھا گلی میں چارپائی ڈالے سو رہا ہے اس کی چارپائی اوندھی مار دیتے ہیں۔ گاگر اُٹھاتے ہوئے دولہا یا دلہن منھ میٹھا کروا کر گھر میں داخلہ دیتے ہیں۔ گھر کے اندر خوب بھنگڑا اور بولیوں کا ناچ ہوتا ہے۔ راستے میں لاٹھی جس پر گھنگھرو بندھے رہتے ہیں۔ لاٹھی والی لاٹھی زمین پر مار کر آگے بڑھتی ہے۔ عورتیں اسی انداز سے اور وہی گیت گاتی ہوئیں آگے بڑھ جاتی ہیں۔''

اور پھر یہ معنی خیز جملہ:

''شہروں میں خلوص اور رواداری کی کمی کی وجہ سے جاگو کی رسم بہت کم منائی جاتی ہے شہروں میں شور مچانا۔ شرارتیں کرتے ہوئے کسی کا نقصان کر دینا ممکن نہیں ہوتا۔ جھگڑوں کا اندیشہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں یہ رسم شہروں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔''

اور یہ بھی:

''یہ بھائی چارے اور خلوص کی مثال گاؤں میں آج بھی زندہ ہے۔''

تاریخ اور تہذیب کا یہ فرق محض جغرافیائی نہیں ہے بلکہ زندگی کی ترقی وتبدیلی کی جو تفریق وتقسیم ہے اور رخصت ہوتی ہوئی رواداری اور خلوص و محبت کی جو تصویر ہے وہی اصل تخلیق ہے۔ جو کرداروں میں، منظروں میں اور مکالموں میں بولتی ہے۔

ناول کچھ دیر ماضی میں رہتا ہے۔ بلونت کی جوانی میں رہتا ہے۔ یہ تکنیکی اعتبار سے ضروری بھی تھا کہ ناول نگار کو ماضی اور حال کی تصویر اُبھارنی ہے۔ پرانے پنجاب اور نئے پنجاب کی تقسیم بھی پیش کرنی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی جگّو ہے۔ رَم کی بوتل ہے۔ بندوق ہے ساتھ میں افیم بھی۔ ساتھ ہی بے ایمانیاں بھی، لیکن جگّو کی بدمعاشی میں محبت تھی اور اب محبت میں بدمعاشی ہے۔ تبھی تو وہ کہتا ہے۔ ''یار اب میری چارپائی شمشان گھاٹ پر چھوڑ دینا۔'' شرارتی بلونت سنگھ اس دن رو دیا اور ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ''کیسے کیسے لوگ ہو کر گزر گئے!'' اس جملہ کا انحصار محض افراد تک نہیں بلکہ انسانی افکار، تہذیبی آثار اور انسانیت کے دارومدار پر ہے غالباً اسی لیے پوسا نے ناول کو ایک جھوٹ کا نام دیا ہے جس کے پیچھے ایک گہری سچائی چھپی ہوتی ہے۔ گویا کہ ہمارا اصل سروکار اس سچائی سے ہے جو کسی بامعنی انسانی صورتحال سے ہوتی ہے اس کے حجاب سے نہیں۔ اسی لیے ناول کو ایک بڑی اور مشکل صنف کہا جاتا رہا ہے۔ ورجینا وولف نے کہا تھا۔ ''ناول ادب کی سب سے مشکل صنف ہے، پھیلی ہوئی صنف ہے، یہ شتر مرغ کی طرح ہے جو ہر چیز ہضم کر سکتی ہے۔'' مشل ضرافہ نے بھی کہا تھا۔ ''ادب کی وہ صنف جو سماج اور معاشرے کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے بلکہ گزرنا اس کی مجبوری ہے وہ ناول ہے۔'' ناول اور عوام (The Novel & People) کے مصنف رال فاکس (Rolf Fox) نے بھی کہا تھا:

''ناول فرد سے گفتگو کرتا ہے۔ یہ فرد معاشرے اور فطرت کے خلاف عظیم جدوجہد اور کشمکش کی داستان ہے اور یہ ویسے ہی معاشرے میں پروان چڑھ سکتا ہے جہاں انسان اور سماج، فرد اور معاشرہ میں توازن ختم ہو گیا ہو۔''

یہ مثالیں غیر ضروری نہیں۔ عدم توازن کی نزاکتوں اور مصیبتوں کو سمجھتے چلنے کی ضرورت ہے۔ بشیر کے اس ناول میں بھی عدم توازن ہے۔ ماضی اور حال کا، شہر اور گاؤں کا، لیکن یہ عدم توازن ہی ناول کا کراس بنتا ہے جو آگے بڑھ کر زندگی کا کراس بن جاتا ہے جو حال میں بلونت سنگھ اور بیٹے کے درمیان ہے اور ماضی میں باپ سے تھا۔ اسی سے ناول کو زندگی کا بزمیہ کہا گیا ہے اور اس کا رزمیہ بھی، لیکن اس رزمیہ کو کچھ نادان رمزیہ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ناول کی صنف بیانیہ کی صنف ہے جو تخلیق بیانیہ تو ہو سکتی یا تخلیقی کا علامتی بیانیہ اور ہونی بھی چاہیے کہ آپ ناول لکھ رہے ہیں سماجی حالات کی دستاویز نہیں۔ ناول نویسی ایک فن ہے، لیکن ایک پھیلا ہوا فن۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ اس کا پھیلاؤ، اس کی وسعت جو اس کا مرکزی جزو فن ہے وہ علامت نگاری،

استعارہ سازی کے ساتھ زیادہ دور تک کا سفر نہیں کر سکتی۔ یہی اس صنف کا امتیاز ہے۔ اس کی شناخت بھی۔ اچھی بات یہ ہے کہ بشیر کا فن اس امتیاز سے واقف ہے فکشن نگاری کی مشق بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے:

''میں تو اردو افسانے کا طالب علم ہوں۔ ادب میں پچھلے ۴۴ سالوں سے محوِ عمل ہوں یہ میرا پہلا ناول ہے۔ میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں یہ آپ ہی طے فرمائیں گے۔''

اس ناول کا مرکزی کردار جسّی ہے جو بلونت سنگھ کی بیوی ہے۔ دلاور سنگھ کی بہو اور دو بچوں کی ماں۔ اسی کردار کے نام پر ہی ناول کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ ناول تھوڑی دیر کے لیے ہے سے تھا میں چلا جاتا ہے یعنی ماضی کی طرف جسّی کی جوانی کی طرف بلکہ اس سے پہلے قدم کی طرف جو اُس نے بطور دُلہن یا بہو اُس حویلی میں رکھا تھا۔ یہ جملے دیکھیے:

''کتنا سہانا دن تھا جب اُس نے اس حویلی میں پہلا قدم رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا اس غیور حویلی میں سمٹ آئی ہے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ رشتہ دار، گھر کے افراد اور نوکر چاکر ہر کوئی کسی نہ کسی کام میں اُلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ حویلی کی عمارت جیسی اُس دن سجی تھی ویسے دوبارہ دیکھنے کو نہ ملی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پھولوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کا ایک سمندر اُمڈ آیا تھا۔ اُس رات اس نے گھونگھٹ میں سے ایک بار حویلی کی طرف نظر بھر کر دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔''

اور اب ذرا پنجاب کا یہ کلچر دیکھیے:

''حویلی کے صحن میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ سب سے آگے بے جی گلابی دوپٹہ اوڑھے آئیں۔ انھوں نے پھاٹک کے دائیں بائیں سرسوں کا تیل ٹپکایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں آجا۔ جسّی ذرا سنبھل کر—'' وہ تو بس گھونگھٹ میں لپٹی جا رہی تھی اُسے کوئی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے کیا نہیں— پھر ایک دم عورتوں نے مل کر گانا شروع کیا۔ پنجاب میں بنایا بنرا دولہے کو کہا جاتا ہے اور بنّی دلہن کو کہتے ہیں۔ پیتل کی ایک لُٹیا میں دودھ کی لسّی ڈالی جاتی ہے اور اس میں تین چار پیپل کے پتّے ڈالے جاتے ہیں— سب سے پہلے بے جی نے اُن دونوں کے سروں پر لٹیا گھما کر لسّی کا ایک گھونٹ پیا۔ بچی ہوئی لسّی کو دیوار پر گرا دیا۔ اس طرح پانی وارنے کی رسم ہوئی۔''

ناول میں ایسے مناظر محض لطافت کے لیے نہیں ہوتے۔ ان میں ثقافت کی جلوہ گری ہوتی ہے جو انسانی جبلت و فطرت کی غماز ہوتی ہے۔ جسے ناول کا کشادہ دامن اپنے میں جذب کر کے متن و مواد کو ایک راستہ بھی دیتا ہے اور رویّہ و نظریہ بھی اس لیے کہ ناول زندگی کے مناظر و مظاہر کو پیش کرتا ہے تو فنکار کا مشاہدہ اور مشاہدہ سے بھرا رویہ ناول کی نہ صرف زنیت بلکہ معنویت میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے۔ جسّی کا دُلہن بننا پنجاب کے ایک متمول گھرانہ، ایک حویلی میں داخل ہونے رسموں کی ادائیگی، فوک گیتوں کی نغمگی زندگی کے شب و روز کی وہ تصویریں ہیں جو آگے چل کر انسان کی تقدیر اور زندگی کی تعبیر بن جاتی ہیں۔ اس لیے دُلہن ہمیشہ دُلہن تو نہیں رہے گی۔ ماں بنے گی، ذمہ دار بنے گی، دقتیں آئیں گی۔ رنج و غم کے سایے بھی ٹکرائیں گے اس لیے شادی خوشی کے مناظر محض مناظر نہیں ہوتے بلکہ آنے والے غم کا پیش خیمہ بھی ہوتے ہیں۔ باہر بینڈ کا شور اور اندر عورتوں کے گانے کی آوازیں جلد ہی زندگی کی سری اور بے سری آوازوں میں بدل جاتی ہیں۔

اب جسّی کی زندگی میں آرام کہاں— رومان حقیقت میں بدل چکا تھا۔ پیار آزار میں— پھر اس میں زندگی کے آثار، رسم و رواج، روایت اور حقیقت، پہلے لوہڑی تھی، اب بھاجی اور آخری میں گردوارا— یہ سب کے سب زندگی کو ایک رُخ، ایک نظریہ دیتے ہیں اس لیے ناول کے کینوس میں ان کا عمل دخل، چہل پہل ناگزیر ہوا کرتا ہے۔ مصنف نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ناول صرف قصّہ نہ بننے پائے بلکہ پنجاب کا آئینہ— پھر آئینۂ حیات— ناول یہیں سے اہمیت اختیار کرنے لگتا ہے اس لیے کہ زندگی صرف سفید چاندنی نہیں ہے۔ نرم قالین بھی نہیں ہے جس کی اہمیت شادی کے ایّام میں تو ہے، لیکن رفتہ رفتہ سفرِ حیات میں تو زندگی کی کڑی دھوپ، دھوپ میں پسینہ، رگڑے جھگڑے، رنج و غم سبھی کچھ در آتے ہیں جس کے تدارک میں تو پیپل میں ڈالے ہوئے آٹے بھی کام نہیں آتے۔ دودھ شکر سے بھری لسّی بھی کڑوی لگنے لگتی ہے۔ پری چہرہ، زندگی کے تھپیڑوں، سرد گرم حادثوں سے عام انسان کا تھکا ماندہ چہرہ بن جاتا ہے۔ دیکھئے ایک جسّی یہ ہے:

''ایسی پری چہرہ دُلہن اتنی سندر پہلے کبھی اس گاؤں میں نہیں آئی۔ رنگت ایسی جیسے مکھن پہ کیسر کا رنگ گھول کر ڈال دیا گیا ہو۔ تیکھے تیکھے نین نقش مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ، ستواں ناک، پیالہ سی خمار آلودہ آنکھیں، باریک پہلی تاریخ کے چاند جیسی بھویں، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لٹکے سیاہ بال اوپر سے ہیرے اور سونے کے نئے نقش والے زیورات۔''

دوسری جسّی یہ ہے:

''آرام — جسی کو — اور اس گھر میں یہ نہیں ہوسکتا۔''

''کام کرنے کے لیے بھلے گھر میں نوکر ہی ہوں۔ عورت کو سارے کام سیکھ لینے چاہئیں۔''

''پچنی کپڑے ٹانگ — آسمان صاف ہوتا ہے تبھی دھند پڑتی ہے۔ تھوڑی دیر میں دھوپ نکل آئے گی تو کپڑے ٹانگ — میری کمر میں پتہ نہیں کیوں درد ہونے لگا —''

''اس کی کمر میں درد نے کروٹ لی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ کپڑے بدل کر وہ بیڈ پر دراز ہوگئی —''

مہندی لگے ہاتھوں میں اب آٹا ہے۔ روٹی ہے اور زندگی ہے۔ اُدھر آڑھت ہے، وکیل ہے، مقدمہ ہے اور دوائی ہے۔ یہ ہے زندگی کی اصل حقیقت جس کے سامنے رومان بہت پیچھے چلا جاتا ہے تبھی تو بے حد پیار کرنے والے شوہر سے خوبصورت و حسین بیوی یہ کہنے پر مجبور ہوتی ہے:

''بلونتا جی! آپ یہ بتاؤ یہ سب کب تک چلے گا؟''

''کب تک بیوی کے پلّو سے بندھے رہو گے — رب کے واسطے کام پھر سے شروع کرو۔'' ایک بار پھر بلونت کا رومان — لیکن اب رومان میں احتجاج —

''مرگئی جسّی۔ ہر وقت ایک ہی نام رٹتے رہتے ہو — کل سے اگر کام پر نہ گئے تو میرا مرا منھ دیکھو —!

رومان کے کافور ہوجانے کے لیے صرف یہ جملے کافی ہیں، لیکن اس رومان کے اندر بھی ایک رومان ہے زندگی کا رومان جس کا راست طور پر حقیقت سے تعلق ہے۔ محبت کے ساتھ محنت کی اپنی جمالیات ہوا کرتی ہے جس کی پنجاب اعلیٰ ترین مثال ہے۔ تاہم اشاروں اشاروں میں جسّی مردانہ سماج کو سمجھاتی ہے اس لیے کہ جسّی جتنی حسین ہے اتنی ہی سمجھدار اور ذمّہ دار بھی — اسی لیے مرکزی کردار ہے، جسّی ہے بلونت نہیں ہے اسی لیے کچھ دنوں کے بعد ہی وہ کہنے لگتی ہے — ''ہٹو تمھیں تو ہر وقت ایک ہی کام سوجھتا ہے۔ پیار پیار پیار'' ان جملوں میں پیار سے انکار کے باوجود پیار ہے، ہلکی سی ناراضگی بھی اور زندگی کے تئیں وابستگی بھی جو عورت میں زیادہ دکھائی دیتی ہے خواہ وہ کتنی ہی چہار دیواری میں محدود ہو۔ مرد شادی کے ابتدائی دنوں کے لطف و انبساط میں غرق ہے اس کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا اسی لیے جسّی کہتی ہے سورداس ہو پکّے۔ سورداس سورداس کی اشاریت اور بلاغت بہت کچھ کہے دیتی ہے۔

بلونت سنگھ اور جسّی کی غیر معمولی محبت کا ثمر اس دنیا میں روتا ہوا وارد ہوتا ہے۔ یہ جملہ دیکھئے:

''پھر ایک دن حویلی کا وارث سردار دلاور سنگھ کا پوتا اس دنیا میں روتا ہوا پیدا ہوا، آ گیا۔'' ''روتا ہوا!'' جملہ غور طلب ہے کہ یہ محض جملہ نہیں ہے ایک فلسفہ ہے، بے حد خوشی کا موقع ہے، لیکن اس میں بھی رونا ہے دنیا میں آتے ہی رونا۔ زندگی ہنسنے اور رونے کا ملغوبہ ہے، بلکہ رونا کچھ زیادہ ہے اس لیے بوقت مسرت بھی آنسو نکل آتے ہیں، اس سے زندگی میں آنسوؤں کی، رنج و غم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زندگی اسی رنج و غم، طرب و الم اور سرد و گرم کا نام ہے۔ اُدھر بچہ رویا، ادھر حویلی میں گہما گہمی شروع ہوگئی، لڈّو بٹنے لگے۔ دولت دونوں ہاتھوں سے لٹائی گئی۔ شراب پی گئی۔ زندگی کا نشہ سوار ہوگیا اور زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے۔ ''جس کی پیٹھ برداشت نہ ہو اس کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔'' اور یہ تنبیہ و ہدایت۔ ''اگر تو نے اپنے آپ کو نہیں بدلا تو حویلی کی شان و شوکت۔ میری یہ سرپنچی کی گدّی، سب کچھ میرے ساتھ ختم ہوجائے گا!'' کہ زندگی کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ زندگی کے ساتھ ساتھ رعب و داب، اختیار و اقتدار، مال و دولت کی ہوس بھی ختم نہیں ہوتی وہ منتقل ہوتی رہتی ہے جیسے سردار دلاور سنگھ اب بلونت سنگھ کو منتقل کرنا چاہتا ہے تاکہ اختیار اور شان و شوکت کا سلسلہ نسل در نسل تادیر قائم رہے اور جوان بلونت سنگھ کو بہر حال غور کرنا پڑتا ہے۔ سنجیدہ ہونا پڑتا ہے اس لیے کہ زندگی محض ہنسی کھیل، سیر و تفریح نہیں ہے صرف رومان کا نام نہیں ہے وہ ایک سفاک حقیقت ہے۔ بے رحم جدلیت ہے۔ اگر قدم سنبھلتے نہیں تو ڈگمگانے میں دیر نہیں لگتی شاید یہی وجہ ہے کہ ایک صبح بلونت کے قدم از خود کھیت کی طرح مُڑ گئے اور دُلہن سوال کرتی ہے:

''بے جی! آج وہ سویرے سویرے کہاں چلے گئے؟'' یہ حیرت نہیں زندگی کی حقیقت ہے کہ اولاد ہوجانے کے بعد باپ بن جانے کے بعد ایک نئی صبح ہوتی ہے۔ سورج کی کرنیں ایک نیا پیغام لے کر آتی ہیں اور بقول مصنف:

''وہ دن بدن سنجیدہ ہوتا چلا گیا — دو سال کے بعد بیٹی پریتی کی پیدائش کے بعد تو وہ جیسے یکسر بدل گیا تھا —''

یہ بدلاؤ — اولادوں کی وجہ سے بھی ذمہ داریوں کی وجہ سے بھی، باپ کے بزرگ ہونے کی وجہ سے بھی۔ جسّی کی ممتا کی وجہ سے بھی — زندگی کے کتنے رنگ، سرسوں کے پھول کی طرح، بسنت پنچمی کی طرح اور پھر پنجاب میں شامل ہوا ایک اور رنگ — لال خون کا رنگ جس کی وجہ سے پنجاب آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ زندگی کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔ محبت

سے پرے انسانوں اور اس کی نفرتوں کا رنگ، یہ جملے دیکھیے:

''ان دنوں ہنستا کھیلتا پنجاب ایک بار پھر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ مذہبی جنون خون کی ہولی کھیلنے لگا۔ ہر طرف نفرتوں کی آندھیاں چلنے لگیں۔ ٹپّوں چھندوں اور بولیوں کی جگہ پنجاب میں ماؤں، بہنوں کے بین گونجنے لگے۔ سہاگنوں کی مانگ اُجڑنے لگی۔ ماؤں کے لاڈلے دہشت گردی کا شکار ہونے لگے۔ بچوں کے سر سے ان کے تحفظ کے سائے اُٹھنے لگے۔ دن خوف اور بے یقینی کے سائے میں گزر جاتا۔ رات کے اندھیرے آسیب بن کر چنگھاڑنے لگے۔''

خوف ورنج کی اپنی دہشت اور نفسیات ہوا کرتی ہے۔ اگر وہ مذہب کے حوالے سے ہو تو صورت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ ناول ایک موڑ لیتا ہے اور اس موڑ پر ایک نیا کردار سکھا سنگھ دہشت گرد داخل ہوتا ہے۔ اپنے فیڈریشن کا ایئر کمانڈر رکھے اور ساتھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی کا قتل اور خود پوشی کے ساتھ ساتھ خود فراموشی اور اس طرح کے جملے۔ ''مرنا تو ہے ہی پولیس کی گولیوں سے مریں یا دارو پی کر۔ یہاں جینا کون سالا چاہتا ہے۔'' بیحد قیمتی زندگی سے اتنی بیزاری اپنے آپ میں ایک کہانی رکھتی ہے جو عام حقیقت سے بھی زیادہ بے رحم اور سفاک ہے۔ بھوک کی کیفیت، ڈھابے کا منظر، پنجابی کھانے، میٹ کی طلب، شراب کی للک یہ سب دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ناول کی تخلیقی فضا بنتی ہے۔ درمیان سے ایک نئی کہانی پھوٹتی ہے۔ آئی۔ جی کے قتل اور اس سے قبل ایک معصوم نوجوان کے قتل کی سنگین کہانی، ساتھ ہی دہشت گرد بننے کی بھی کہانی اور پھر ایک بزرگ کی یہ دُعا:

''واہے گرو— ہمارے پنجاب کو بھی کسی کی نظر کھا گئی۔ کبھی دس کبھی بیس پنجابیوں کا قتل ہو رہا ہے۔ عام آدمی مرے۔ آتنک وادی مرے یا پولیس والے مریں ہیں تو پنجابی ماؤں کے بیٹے— کب ٹھنڈا ہوگا یہ خون خرابے کا بازار—؟''

بظاہر مقاصد دونوں کے ایک، لیکن راستے الگ الگ۔ یہ حقیقت کا ایسا کراس (Cross) ہے جو سماج کے تانے بانے بنتا ہے اور نئی حقیقتوں کو جنم دیتا ہے اور وہ حقیقت ہے انسانیت اور حیوانیت کے درمیان تصادم کی۔ بھٹکاؤ کی جو ایک نئی مصیبت یا حقیقت بن کر پنجاب کے ہرے بھرے کھیت باغ کو بارودی بنائے دے رہی تھی۔

لیکن بلونت سنگھ، دلاور سنگھ نہیں ہے۔ جوان ہے، جوشیلا ہے، ٹکراؤ۔ الگاؤ اور گھاؤ ہی گھاؤ جس رحم دل نے پیٹ بھرا، جس نے پناہ دی، دہشت گردوں نے اسی کی بیوی بہو پر خراب نظر ڈالی۔ اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ جسّی کے حسن نے پاگل کر دیا اور شہوت و بربریت کا ایک کربناک و المناک کھیل ہو گیا۔ یہ جملے پوری داستان کہے دیتے ہیں:

''وہ چیختی رہی اور مدد کے لیے بلونت کو پکارتی رہی۔ زخم کھا کر گورنا سا مزید خون خوار ہو گیا تھا۔ دونوں جانور بن چکے تھے۔ وہ جسّی کو نوچنے لگے۔ جب انسان جانور کا روپ اختیار کر لیتا ہے تو اسے دوسرے انسان کے درد کا احساس نہیں رہتا۔ یہ ظالمانہ کھیل دو گھنٹے تک چلتا رہا۔''

اور بلونت باپ کو کہتا رہا:

''دیکھ لیا ان لوگوں پر ترس کھانے کا نتیجہ؟ کھلاؤ ان کو روٹیاں بھینٹ کروان کو نوٹوں کی گڈیاں— دیکھو— وہ تمھارے خاندان کی بہو کا کیا حال کر رہے ہیں۔ آپ بہت بڑے سردار ہو۔ سرپنچ ہو— کرو کچھ حیلہ۔''

اور جسّی لُٹ گئی۔ پنجاب کا حُسن لُٹ گیا۔ دہشت گردی نے پنجاب کی سرزمین پر دہشت و بربریت کی ایک نئی فصل اُگا دی۔ دہشت گردی کوئی بھی ہو، کہیں کی بھی ہو بقول بلونت:

''کھاڑے[1] کسی کے سگے نہیں ہوتے— یہ صرف گولی کی زبان سمجھتے ہیں۔ آپ کو بھگوان کہلانے کا شوق ہے بنو بھگوان اور دیکھو اپنی بربادی۔''

اور پھر آنسو، صدمہ، حادثہ اور بلونت کا خودکشی کا ارادہ— مرد کردار کی نفسیات جو غصّہ، صدمہ اور بے بسی سے بھری ہوئی ہے جس کا نتیجہ فوری طور پر آنسو اور ایک سوال— ''میں کیا کروں؟'' اس نفسیاتی کشمکش کو ناول نگار نے عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے کہ ناول میں کشاکش اور کشمکش کا دائرہ بڑا ہو تو کینوس ازخود بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قصّہ یا واقعہ اختیار کرتے وقت یہ سمجھتے چلنا چاہیے کہ اس کا گھیرا کتنا ہے۔ اگر واقعہ یا قصّہ انسانی اور زمینی اثر انگیزی نہیں رکھتا یا انسانوں کی زندگی کے اہم مسئلوں اور پیچیدہ مرحلوں کو نہیں چھوتا یا کسی انسانی، تہذیبی اور سماجی مسئلہ یا بحران کا مظہر قصّہ نہیں بنتا تو ایسا قصّہ اپنی اہمیت نہیں منوا سکتا خواہ ناول نگار نے کتنی ہی محنت کیوں نہ کی ہو۔ پریم چند نے بڑی سادگی سے کہا تھا۔ ''میں ناول کو انسانی کرداروں کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔'' اور آگے یہ بھی لکھتے ہیں— ''کرداروں کی مشابہت اور اختلاف یکسانیت میں تضاد

[1] پنجابی زبان میں دہشت گرد

اور تضاد میں لکھا فن دکھانا ناول کا بنیادی فریضہ ہے۔'' ناول میں ایک طرح سے نئی دنیا آباد ہوتی ہے جن معنوں میں ہر انسان الگ سے دیکھنا چاہتا ہے۔اسی لیے ہر ناول ایک تجربہ ہوتا ہے جس میں زندگی کا تجربہ جھانکتا ہو خواہ وہ تلخ ہو یا شیریں۔

بلونت سنگھ کی افسردگی، پژمردگی اور اس سے زیادہ اپنی بیوی کی حفاظت نہ کر پانے کا اضطراب ہے اس لیے پشیمانی کی آخری حد پر ہے۔ دوسری طرف جسّی لہولہان ہے، لیکن اسے پھر بھی شوہر کا خیال اور مان ہے۔ یہ ہے پنجاب کی محبت جو انسان کی محبت بن کر تہذیب و تاریخ کے نازک ترین احساس و شعور کو چھونے لگتی ہے۔ ناول اس جذبہ، سرشاری، قربانی اور پشیمانی کے متضاد و متصادم سے بڑا ہوتا ہے محض کہانی سے نہیں۔ مرد یا شوہر بار بار یہ کہہ رہا ہے۔ ''میں جسّی کا سامنا نہیں کر سکتا۔!'' لہولہان بیوی یہ کہہ رہی ہے — ''بٹو کے پاپا کہاں ہیں وہ ٹھیک تو ہیں؟'' محبت، جذبہ، قربانی اور پشیمانی کا یہ آڑا ترچھا احساس، قصّہ کا کراس (Cross) بنتا ہے۔ بٹو کے پاپا کی آواز اور بچوں کا باپ سے لپٹ جانے کا انداز زخموں کو بھرنے میں مدد تو کرتا ہے، لیکن غیر مردوں کا شکار ہوئی بیوی کا وہ سامنا نہیں کر پاتا۔ مظلوم و معصوم ہونے کے باوجود، تمام تر ہمدردیوں کے باوجود ایک پھانس اس کے احساس میں اُتر جاتی ہے جو جھلاہٹ بھرے ان جملوں میں کھٹکتی نظر آتی ہے:

''تو یہاں کیوں آئی ہے؟ میری جان لے گی۔ مجھے مارے گی!''

اور زخم خوردہ جسّی مر مٹنے والے شوہر کی اذیتناک بے گانگی کا جواب صرف ان جملوں میں دیتی ہے:

''میں اور کہاں جاؤں۔ آپ کے بغیر میرا وجود بے معنی ہے۔!''

وجود و وجود بلونت چلاتا تو رہا، لیکن جس کے وجود کے بغیر بلونت اکیلا اور بلونت کے بغیر جسّی بھی اکیلی۔ یہ ہے ہندوستانی زن و شو کے رشتے جنھیں پنجاب کے آبدار اور شاندار خطہ میں وہ جلا ملی کہ بلونت تو چلاتا رہا اور جسّی کہتی رہی۔ ''اپنے آپ کو سزا نہ دو!'' لیکن وہ سزا جو بے قصور جسّی کو مل رہی تھی اور جس سے اس کی جذباتی دنیا اُجڑ رہی تھی۔ لیکن بیوی سو طرح سے پھر بھی نثار۔ عقیدت و محبت کے یہ بھی انوکھے آثار جو ہندوستان میں، پنجاب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ زندگی میں قدم قدم پر سمجھوتے ہوا کرتے ہیں۔ جسّی نے سمجھوتہ کر لیا اپنے لیے نہیں کہ اب اس کا وجود معدوم ہو چکا تھا اپنے بچوں کے لیے۔ ادھر بلونت بھی راضی اور خاموشی یہ معنی خیز جملہ۔ بلونت نے اپنے کھیتوں کی طرح خود کو مٹی بنا لیا۔ وہ بچوں کو جوان ہوتے ہوئے دیکھ کر جی رہا تھا۔ لیکن اس ''جی'' میں جسّی پھول کی مہک کی طرح کم کانٹے کی خراش کی طرح کچھ اس طرح سما گئی تھی کہ وہ اس کو ظاہر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جذباتی ہمدردی اور جنسی وابستگی محض انسانی رویوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ایک بے نام سا فاصلہ بن گیا اور یہ فاصلہ وقت کی دھار پر چڑھتا چلا گیا۔ بچے جوان ہو گئے۔ جسّی بوڑھی ہو گئی اور ناول اختتام پر آ پہنچا، لیکن ناول نگار نے بلکار سنگھ کا ایک کردار داخل کر کے ایک اور بامعنی موڑ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

امریکہ سے لوٹا بلکار سنگھ، بلونت سنگھ کا دوست نکلا جو اچانک دشمن بن گیا۔ ایک اور کہانی نکلی آج کے بے رحم اور پیچیدہ سماج کی کہانی۔ لیکن حادثہ اور تجربہ کا مارا ہوا بلونت نیکی کا راستہ نکالتا ہے، لیکن ایک بار پھر غصّہ اور یہ جملہ۔ ''دولت نے تجھے اندھا کر دیا۔ دنیا کا مالک بن گیا ہے تو جس لڑکی کا چاہو ریپ کر دو۔ جسے چاہو مروا دو۔ تیرے باپ کا راج ہے!''

یہ کسی ایک فرد سے نہیں پورے نظام سے سوال ہے، طاقت، دولت اور دہشت کا کھیل جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس سے سوال ہے۔ آنے والی نسل سے سوال ہے کیونکہ اکثر و بیشتر یہ قیمت اسی کو چکانی پڑتی ہے۔ جیسے بٹو کو چکانی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے والدین کو بھی۔ اس لیے کہ دولت، طاقت اور دہشت کے ناپاک کھیل کے نتائج برسوں اور نسلوں چلتے ہیں۔ درمیان میں پولیس، کچہری، عدالت کے پیچیدہ کھیل جو اسی نظام کا اذیتناک حصّہ ہیں۔

بلونت سنگھ کی موت، جسّی کی بیوگی اور بے حسی، آنکھوں کی خشکی، دادی کی بے ہوشی، بچوں کا ماتم اور انتہا پر پہنچا ہوا زندگی کا غم، پتھرائی آنکھیں اور جسّی کی بہن کا یہ جملہ جو ناول کا کلائمکس بن جاتا ہے:

''اری تم لوگوں کو خبر نہیں۔ بلونتے کے ہوتے ہوئے میری بہن تو پچھلے بیس سالوں سے بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ کسی نے اس کا دُکھ جانا۔ بانٹا کسی نے اس کا درد؟

اور اسی طرح کے پرتاثیر جملے جسّی کے کردار کو آخر میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایک حسین و جمیل کردار اچانک جامد و ساکت۔ لیکن اس کے سکوت میں غم و بے چینی کا شور نہاں ہے۔ اس کی خاموشی میں درد انگیزی ہے کہ بغیر بولے ہوئے یہ کردار قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے کہ اچانک جب خاموش بیوی اور عورت کی ممتا جاگتی ہے۔ بچوں کے یتیم ہونے کی آواز کانوں میں گونجتی ہے تو ایک ماں تڑپ کر جاگ اُٹھتی ہے اور ناول ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''پریتی کے یتیم ہونے کے احساس نے ایک بم کام کیا....جیسے کسی نے دریا کے باندھ کو توڑ دیا ہو۔ جیسے کسی نے پاگل طوفان کی زنجیریں کھول دیں۔ جسّی آسمان دیکھ کر جو چیخی تو ساری عورتیں چونک اُٹھیں۔اس کو ایسا لگا جیسے بیس سال پرانا سارا درد اُس نے قدرت کے دامن میں اُگل دیا ہو! بہن نے روتے ہوئے اس کی بغل میں اپنا بازو دے کر اسے اُٹھایا، وہ اپنی رانیں پیٹتی ہوئی بہن سے مخاطب ہوئی:

''کس کی ارتھی کے ساتھ جاؤں....؟ اُس آتنک وادی کی ارتھی کے ساتھ جس کے فاصلوں کا آتنک میں نے بیس سال جھیلا ہے!

جسّی روتے ہوئے عورتوں کے آگے آگے چل پڑی۔ دیکھنے والی آنکھیں مطمئن تھیں کہ جسّی آنسو بہا رہی ہے۔''

ناول یوں تو ایک آتنک وادی کو لے کر لکھا گیا ہے جو خارجی سطح کا ہے، لیکن سماج، معاشرہ کے خارجی واقعات وحادثات انسان کے باطن پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں یہ ایک حسّاس، دردمند اور ذہین ناول نگار، فنکار سمجھ سکتا ہے جو ایک حکیم یا ڈاکٹر بھی نہیں محسوس کر سکتا اس لیے کہ یہاں اُس زخم کی تلاش ہوتی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ رشتوں کی وہ اندرونی کسک جو قطرہ قطرہ ناسور بنتی رہتی ہے۔ ظاہری زخم تو بھر جاتے ہیں، لیکن اندرونی زخم نہیں بھرتے یا بڑی مشکل اور مدّت میں بھرتے ہیں۔اس لیے ناول نگار ایک حساس اور زندہ انسان ہوتا ہے—وہ پورے انسان تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس طرح اس ناول میں ایک مرد ناول نگار نے عورت کے کردار جسّی کو پُر اثر پیرائے میں پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا کلائمکس اسے ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں ناول کا اینٹی کلائمکس جسّی کو غیر معمولی پن میں ڈھال کر ناول کو احساسات کی بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس کے لیے بشیر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ان جملوں پر گفتگو تمام کرتا ہوں:

''میں زندہ انسان ہوں اور جب تک میرے بس میں ہے میرا ارادہ زندہ انسان بنے رہنے کا ہے۔ اسی لیے میں ایک ناولسٹ ہوں اور چونکہ میں ایک ناولسٹ ہوں اس لیے میں آپ کو کسی سنت، کسی سائنٹسٹ، کسی فلسفی، کسی شاعر سے برتر سمجھتا ہوں جو زندہ انسان کے مختلف قصّوں کے بڑے ماہر ہیں، لیکن پورے انسان تک نہیں سمجھتے۔ ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے۔ کتابیں زندگی نہیں، یہ صرف ایتھر ہیں، ارتعاشات ہیں، لیکن ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو شاعری، فلسفے، سائنس یا کسی اور کتاب کے ارتعاش کے بس کی بات نہیں۔''

◆◆◆

مثنوی چراغِ دیر (مع پانچ اردو تراجم)

غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' مع پانچ اردو تراجم، اردو اکادمی، دہلی کی تازہ ترین کتاب ہے جسے ممتاز محقق، ناقد و شاعر اور دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر صادق نے مرتب کی ہے۔ آپ نے تلاش و تحقیق کے بعد اردو کے پانچ اہم ادیبوں کے ترجموں کو حاصل کیا ان میں ظ۔ انصاری، اختر حسن، علی سردار جعفری، حنیف نقوی اور کالیداس گپتا رضا کے تراجم ہیں۔ اختر اسن اور حنیف نقوی نے منظوم ترجمہ کیا ہے جب کہ بقیہ تین تراجم منثور ہیں۔ ''مثنوی چراغِ دیر'' مرزا اسداللہ خاں غالب کی فارسی شاعری کا ایسا شاہکار نمونہ ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مرزا غالب نے یہ مثنوی سفر کلکتہ کے دوران بنارس میں قیام کے دوران لکھی تھی۔ پروفیسر صادق نے اس کام کو ایسے سلیقے سے انجام دیا ہے کہ اس مثنوی کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر کتاب ریسرچ اسکالرز کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرتب: پروفیسر صادق صفحات: ۱۰۸، قیمت: ۴۵ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی